Date of Publication: 16-12-2013 PRICE Rs. 2/-
POSTED ON 17-18 Dec. 2013
R.N.I No. 2186/57
POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)
ہفت روزہ
ہماری زبان
انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 December 2013
Issue: 48, Vol.: 72
۲۲ تا ۲۸ ردسمبر ۲۰۱۳ء
شمارہ نمبر: ۴۸، جلد نمبر: ۷۲

پیدائش کے 100ویں برس میں
عطیہ حسین کی یاد

تحریر: شکوہ محسن مرزا
ترجمہ: مظفر حسین سیّد (29/11، سرسید روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 110002)
E-mail: syedmh92@yahoo.com

دورِ جدید کے ہندستان کے لیے سب سے فیصلہ کن لمحہ ملک کی آزادی کا حصول اور اس کی تقسیم تھا۔ مغل سلطنت کے آخری علامتی تاجدار بہادر شاہ ظفر کی برطرفی کے بعد ہندستانی مسلمان جس تیرہ بختی، صورت حال اور جن اندیشوں سے دوچار ہوئے، دراصل وہی بعد ازاں اس نظریے کی پیدائش کا سبب بنے، جس کے عملی نتائج کے طور پر بالآخر وطن عزیز کی تقسیم ایک تلخ حقیقت بن کر سامنے آئی۔ اس انتہائی تکلیف دہ واقعے نے مسلمانوں کے اندر نہ صرف ایک شدید احساسِ محرومی کو جنم دیا بلکہ یہی حادثہ ۱۸۵۷ء کے بعد بتدریج معاشرتی و معاشی زوال کا سبب بھی تھا۔ مسلم مصلحین قوم و دانشوران پر جب اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ تمام خرابی کی جڑیں دراصل مسلمانوں کے اپنے مذہبی، سماجی، عقلی و ذہنی انجماد کے اندر ہی پیوست تھیں تو اس احساس و ادراک کے بعد مذکورہ مسلم قیادت نے اپنی تمام تر کاوشیں مسلمانوں کی جدید تعلیم پر مرکوز و منعکس کیں، ان زعمائے ملت نے اپنی تحریروں کے توسط سے ترقی پسندانہ خیالات و نظریات کو فروغ دیا۔ ان کی اس جد و جہد کی شدید مخالفت قدامت پرست معاصرین کی جانب سے سامنے آئی، کیوں کہ ان لوگوں نے مغربی تعلیم کو غیر اسلامی قرار دے رکھا تھا۔ اس صورت حال میں قدامت پسندوں اور جدید خیالات کے حامل ترقی پسندوں کے مابین تصادم لازمی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گزشتہ صدی کے ابتدائی عشروں میں پوری ملت مسلمہ میں سیاسی، سماجی، مذہبی نیز علم و دانش کی سطح پر ایک زبردست اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔

ایسے ہی شدید تصادم ذہنی و شورش کے پس منظر میں عطیہ حسین نے ۱۹۱۳ء میں اس جہانِ رنگ و بو میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس وقت مذکورہ بالا تمام امور کے سلسلے میں زبردست مباحثے و مناظرے جاری تھے۔ ان کا خاندان ترقی پسندانہ خیالات کا حامل تھا۔ ایک جانب ان کے والد محترم کیمبرج یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے تو دوسری طرف ان کی تعلیم یافتہ والدہ محترمہ نے خواتین کی تعلیم و فلاح کے لیے لکھنؤ میں ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا اور یہی لکھنؤ عطیہ حسین کا وطن تھا۔ خود عطیہ حسین کی تعلیم لکھنؤ کی منفرد تعلیمی درس گاہ ازابیلا تھوبرن کالج میں ہوئی، یہ کالج تعلیم نسواں کے لیے وقف اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ انگریزی تعلیم کے علاوہ ان کے والدین نے گھر پر عربی اور فارسی کی تعلیم و تدریس کا نظم بھی کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلم خواتین کی تعلیم ایک اہم موضوع کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ سر سید احمد خاں (۹۸-۱۸۱۷) جیسے مصلح قوم، رہبر تعلیم اپنی نگارشات کے ذریعے تعلیم نسواں کی بھرپور وکالت کر چکے تھے، اور اردو کے معروف ادیب ڈپٹی نذیر احمد (۱۹۱۲-۱۸۳۰) کی 'بنات النعش' جیسی تصنیف منظر عام پر آ چکی تھی، جس میں تعلیم نسواں کی پُر زور حمایت کی گئی تھی۔ علاوہ ازیں اس دور کے لکھنؤ میں کئی تنظیمیں فعال تھیں، نیز خواتین کے رسائل نکل رہے تھے، جو تعلیم نسواں کے تئیں بیداری کے علمبردار تھے۔ ۱۹۲۰ اور ۱۹۳۰ کی دہائیوں کا لکھنؤ خاصا سرگرم و پُر جوش تھا، آزادیٔ خیال، انسانیت نوازی، مارکسیت اور ترقی پسند نظریات اس شہر کی آب و ہوا میں گردش پذیر تھے اور خواتین کی ترقی، خود مختاری و مساوات کی حمایت میں بنیاد پرست، روایت پسند اور مغرب مخالف فکر کے حامل طبقات سے نبرد آزما تھے۔ اس ماحول میں عطیہ حسین نے کلکتہ کے انگریزی اخبارات 'پائنیر' و 'اسٹیٹسمین' میں مضمون نگاری کی ابتدا کی۔ ۱۹۳۲ء میں افسانوی مجموعہ 'انگارے' دور رس تخلیقی و دانشورانہ نتائج کے حامل ایک واقعے کی شکل میں منصۂ شہود پر وارد ہوا۔ اس ہنگامہ خیز مجموعے میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانے اور ایک ڈرامہ شامل تھا۔ لکھنؤ کے ان چار نوجوان دانشوروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے مغربی نظریات کو متعارف کرایا تھا نیز اپنی تحریروں کے توسط سے عصری مسلم معاشرے کی تادیب کی کوشش بھی کی تھی۔ ان انقلابی جدت پسندانہ صداؤں نے عطیہ حسین کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اپنے جاگیردارانہ پس منظر کے باوجود وہ اپنے طبقے اور اپنے معاشرتی گرد و پیش میں رواں دواں منافقانہ و متضاد رویوں کا احساس و ادراک کرنے پر قادر تھیں۔

عطیہ حسین کا حساس ذہن اپنے اعلا جاگیردارانہ طبقے اور اس میں پیوست سماجی درجہ بندی، نیز ناخواندگی، افلاس اور خواتین کے استحصال کا مشاہدہ کرکے بُری طرح بے قرار و بے چین تھا۔ اعلا حسّیات کی حامل ان جیسی خاتون کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ بائیں بازو کی فکر اور ترقی پسندانہ نظریات کا اثر قبول نہ کریں، اور یوں بھی ان دنوں کا لکھنؤ ایسی تمام معاشرتی تحریکات کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ خود ان کے برادر حقیقی بائیں بازو کے رجحانات کے پیروکار تھے اور ملک راج آنند، احمد علی اور سجاد ظہیر جیسے قد آور ادیبوں کے حلقے میں شامل تھے۔ ۱۹۳۶ء میں عظیم ادیب پریم چند کی صدارت میں جب ترقی پسند تحریک کا افتتاحی جلسہ منعقد ہوا تو عطیہ حسین اس کے شرکا میں شامل تھیں۔

عطیہ حسین نے کم عمری میں ہی افسانہ نگاری شروع کر دی تھی۔ انگریزی زبان میں ان کا اولین افسانوی مجموعہ 'فینکس فلیڈ' (Phoenix Fled) کے عنوان سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد ان کا واحد ناول 'سن لائٹ آن اے بروکن کالم' (Sunlight on a Broken Column) ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ تاہم ۱۹۹۸ء میں ان کی وفات کے بعد ان کے کاغذات میں سے ان کا ایک نامکمل ناول 'نو نیو لینڈز، نو نیو سیز' (No New Lands No New Seas) برآمد ہوا، جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کچھ غیر مطبوعہ تخلیقات پر مشتمل ایک افسانوی مجموعہ بعنوان 'ڈسٹنٹ ٹریولر: نیو اینڈ سلیکٹڈ فکشن' (Distant Traveller: New and Selected Fiction) بھی اشاعت پذیر ہوا ہے۔

عطیہ حسین کے افسانوں میں، ان کی تخلیق 'اسٹورم' (Storm) کو ان کی نمائندہ تخلیق قرار دیا جا سکتا ہے، جس کی خوبی اس کا طرزِ تحریر نیز سادگی اور طنزیہ لہجہ ہے۔ عطیہ حسین اپنے کرداروں کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ وہ بے مصرف اور مافوق الفطرت معلوم ہوتے ہیں، تاہم انھوں نے کرداروں کو اپنے گرد و پیش کی دنیا سے ہی مستعار لیا ہے۔ جب ایک اجنبی عورت طوفان سے اپنی جان بچا کر ایک اعلا طبقاتی خاندان کی پناہ میں آتی ہے، تب اس اونچے گھرانے کی خواتین کا رعونت بھرا رویہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ تاہم اس خاندان کی ایک نوجوان لڑکی اس اجنبی عورت کی مدد کرتی ہے اور اسے ایک عدد چھتری فراہم کرتی ہے تاکہ وہ بارش میں بھیگے بغیر باہر نکل سکے۔ وہ لڑکی اس عورت سے اس کے بعد بھی بار بار ملاقات کرتی ہے، لیکن جب اس بات کا علم اس کے خاندان والوں کو ہوتا ہے تو اس پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے کہ وہ اس خاتون سے کبھی نہ ملے۔ اس طرح مصنفہ اعلا طبقے

کی اعلا سطح ابن الوقتی کو منظر عام پر لاتی ہیں۔ ان کا افسانہ 'فینکس فلیڈ' (Phœnix Fled) اپنے اختتام کے لیے معروف ہے۔ اس کا مرکزی کردار ایک ضعیفہ ہے، جو اپنا پشتینی مکان چھوڑ کر تقسیم وطن کے نتیجے میں تشکیل شدہ ایک نئے ملک میں جانا نہیں چاہتی۔ اس کا خاندان اسے تنہا چھوڑ کر ترکِ وطن کر لیتا ہے۔ جب ایک ہجوم اس کے پشتینی مکان کو نذر آتش کرنے پر آمادہ ہوتا ہے تو وہ اپنی گہری تشویش کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہے:

''سوچ لو''۔ وہ اپنے استخوانی وجود کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے ''سوچ لو، کہیں تم ایک گڑیا گھر میں تو داخل نہیں ہو رہے ہو''۔

جذباتی رنگ آمیزی کے باوجود اس افسانے کے المناک اختتام کا موازنہ مشہور انگریزی مصنفہ کیتھرین مینس فیلڈ (Katherine Mansfield) سے کیا گیا ہے، جن کا اثر عطیہ کی تخلیقات پر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے افسانے حقیقت نگاری، نیز پُرقوت جزئیات نگاری سے مزین ہیں، علاوہ ازیں ان کا طرزِ نگارش بلاشبہ ترقی پسند مصنفین کی حقیقت پسندی کے اثرات سے بھی مملو نظر آتا ہے۔

اعلا مرتبت شاعری۔ ایس۔ لیوس (C. S. Lewis) کے ذریعہ افزائش حوصلے کے سائے میں عطیہ حسین نے اپنا ناول انگلستان میں تخلیق کیا۔ ان کی کہانی کی راوی چودہ برس کی ایک لڑکی لیلیٰ ہے، جو عطیہ کی کہانی 'اسٹورم' میں جلوہ گر پُرجوش تخلیق کاری، مانندی اپنے گرد و پیش کی دنیا کے کھوکھلے پن، خوش امیدی و خوش فہمی، نیز ابن الوقتی کو بے نقاب کرتی ہے۔ اپنے طبقے اور اپنے خاندان کو اپنی غیر متعصبانہ نظروں سے دیکھنے کی اپنی اہلیت کو برقرار رکھتے ہوئے عطیہ حسین ابہام و تفاوت کے سیلاب رواں میں بہتے ہوئے تمدن کو اپنے قلم کی گرفت میں لانے میں کامیاب ہیں۔ 'سن لائٹ آن اے بروکن کالم' میں بیسویں صدی کے نصف اول کے مسلم معاشرے کو پیش کیا گیا ہے۔ اپنے ہمسر و ہم عمر لڑکوں کے مثل اعلا تعلیم کے حصول کی خواہش مند لیلیٰ کو اپنے خاندان کی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس دنیا اور اس ماحول کی دوسری ستم ظریفی یہ ہے کہ اعلا طبقے کی ایک دوشیزہ زہرہ کی شادی اس کی مرضی و منشا کے خلاف کرا دی جاتی ہے، جب کہ اس کے عین برعکس ایک ملازمہ نندنی کو اپنی پسند کے مطابق اپنا جیون ساتھی چننے کی اجازت دی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عطیہ حسین ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی کرتی ہیں جس میں مذہب اور عقیدہ ہنوز وجہ تقسیم نہیں تھے بلکہ اس میں ثقافت کی دولت اور رنگارنگی برقرار تھی، نیز خصوصی نوعیت کے تہوار، رسوم و عقائد بھی رائج تھے۔ سچ یہ ہے کہ عطیہ نے کبھی اس امر کو تسلیم نہیں کیا کہ ایک ایسا معاشرہ جس میں مختلف مذاہب اور ثقافتیں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ نشو و نما پاتی تھیں، وہ معاشرہ یک دم منتشر ہو سکتا تھا۔ ان کی تحریر میں درد اور رنج تو ہے مگر تلخی، مایوسی اور بے چینی نہیں ہے۔

جب تقسیم وطن کے پانچ برس بعد انھوں نے اپنا خاندانی مکان دیکھا تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس میں ایک طرزِ حیات مدفون ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک نئی زندگی نے لے لی تھی، جسے اس عمارت نے قبول بھی کر لیا تھا۔ انھوں نے بعد میں لکھا کہ ''اس کی تباہی و بربادی میں میں نے ان تمام برسوں کو دیکھا، جو ہمارے خاندان نے وہاں گزارے تھے۔ سست رفتار برسوں نے ایک طرزِ حیات کو جنم دیا تھا اور مختصر برسوں نے اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ دراصل ان کے ناول 'سن لائٹ آن اے بروکن کالم' کی شانِ نزول اسی لمحے میں پوشیدہ تھی۔ اس ناول کا عنوان ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T. S. Eliot) کی نظم 'دی ہولو مین' (The Hollow Man) سے مستعار ہے۔ جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ یہ ناول دراصل ایک خاندان کی شکست و ریخت کا مرثیہ ہے، جب سارا پس منظر بدل رہا تھا۔ ان کا یہ ناول اس تباہی و بربادی کی علامت ہے، جس کا شکار ان کے وطنی شہر کا پھلتا پھولتا تمدن اچانک ہی ہو گیا تھا۔ وہ تمدن ایک طرزِ حیات تھا، زندگی کا ایک انداز تھا جو اپنے تمام تر نقائص کے باوصف نشاط و مسرت سے لبریز تھا اور اس میں کم از کم ایک پائیدار جہان کا سراب نہیں تھا۔

عطیہ حسین اپنے مذکورہ بالا ناول میں مستحکم احساسات و تصورات پیش کرنے میں کماحقہ کامیاب ہیں، نیز یہ ناول اس خواہش کے تحت لکھا گیا ہے کہ تیزی سے ناپید اور تحلیل ہوتی ایک دنیا کو قصے کی گرفت میں لا کر پیش کر دیا جائے، ایک دنیا جو اب صرف ان کی یادوں میں آباد تھی۔ احمد علی کی تخلیق 'دلی کی آخری شام' کے مثل انھوں نے بھی دراصل ایک روزنامچہ تحریر کیا ہے، ایک دستاویز تیار کر کے پیش کی ہے۔ ان کے ناول کو یقینی طور پر ایک ایسی مکمل و جامع تخلیق کے طور پر دیکھا جانا چاہیے، جو ایک زوال آمادہ جاگیرداری نظام کی تصویر کشی کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس دورِ حیات میں پنہاں ان سیاسی و ذہنی داخلی تحرکات کی بھی نشان دہی کرتی ہے، جن کا نتیجہ بالآخر وطن عزیز کی تقسیم کی شکل میں برآمد ہوا۔ تاہم ان کے اس شاہکار ناول کو محض اس تبصرے تک محدود کر دینا بھی درست نہیں، بلکہ ناانصافی ہے، کیوں کہ یہ ناول اپنی جداگانہ حیثیت میں سیاسی و معاشرتی حدود سے خوب تجاوز کرتا ہے۔ بعد میں خود مصنفہ نے اس امر کا اعتراف کیا کہ انھوں نے اس ناول کی تکمیل کا فیصلہ اپنے اس احساس کے زیرِ اثر کیا کہ وہ دنیا جس کی وہ باسی تھیں، وہ انحطاط پذیر ہو کر وجود سے عدم کی جانب آمادۂ سفر تھی۔ علاوہ ازیں ان کے اس تخلیقی عمل کی محرک ان کی یہ زبردست خواہش تھی کہ نسلِ آئندہ کی موجودگی کا اعتراف بھی کیا جائے اور اس کی اہمیت کو درج بھی کر دیا جائے، کیوں کہ اب بھی ایسے افراد معاشرے میں موجود تھے جو مستقبل میں کامل یقین رکھتے تھے۔ درحقیقت انسانی زندگی کے تئیں عطیہ حسین کا یہی عقیدہ ان کے وسیع تر ذہنی افق کو اجاگر کرتا ہے، نیز انسانی روایات کے عین مطابق ایک عظیم ادیبہ کے طور پر ان کی حیثیت و مرتبے کی توثیق کرتا ہے۔ ●●

یادِ رفتگاں

سیّد نجیب اشرف ندوی کے ادبی کارنامے

محمد ایوب واقف

سی کوین ایونیو-بی، فلیٹ نمبر ۷۰۵، ساتویں منزل، سیکٹر ۱۴، کوپر کھیرانے، نئی ممبئی-۴۰۰۷۰۹

حضرت نظام الدین اولیاؒ اکثر کہا کرتے تھے کہ روزِ حشر اگر خدا نے مجھ سے سوال کیا کہ نظام الدین تم دنیا سے میرے لیے کیا لائے ہو، تو میں کہوں گا کہ میں امیر خسرو کو لایا ہوں۔ ٹھیک اسی طرح اگر خدا نے مولانا شبلی نعمانی سے یہ سوال کیا کہ شبلی تم دنیا سے کیا لائے ہو، تو مولانا شبلی نعمانی خدا کے حضور یہ عرض کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ سید سلیمان ندوی کو لائے ہیں۔ شمس العلما مولانا شبلی نعمانی نے اپنے فکر رسا اور اجتہادی خیالات کے ذریعے اپنا ایک باقاعدہ مکتب فکر قائم کیا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی کے اس ہمہ گیر مکتب فکر کے سرخیل اور روشن مینار تھے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال انھیں علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد کہا کرتے تھے۔ مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی جیسے اکابرین فکر و دانش کا براہ راست تعلق بھی شبلی اسکول سے ہی تھا۔ شبلی مکتب فکر کے جن خاصانِ کمال اور ائمہ ہوش و خرد نے برصغیر کی مشہور علمی خانقاہ دارالمصنفین میں بیٹھ کر علوم و فنون اور غور و فکر کے چراغ روشن کیے، ان میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ ندوی صاحب مرحوم دارالمصنفین میں تقریباً آٹھ سال تھے، ان آٹھ برسوں میں علمی، ادبی اور تاریخی موضوعات پر جتنا وسیع اور جامع کام کرنے کی انھوں نے سعی مشکور کی اس کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اگر وہ دارالمصنفین کو خیرباد نہ کہتے اور مستقل مزاجی سے کام کرتے رہتے تو اردو کے چند بہت ہی کامیاب اور نامور محققین اور مورخین میں شمار کیے جاتے۔ لیکن افسوس کہ ممبئی کی ان کی گوناگوں مصروفیات نے انھیں مستقل مزاجی سے کام نہیں کرنے دیا۔ اس سے تحقیق نگاری اور تاریخ نویسی کا غیر معمولی نقصان ہوا۔

سید نجیب اشرف ندوی مرحوم کے یادگار کارناموں پر میں یہاں ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتا ہوں لیکن اس سے قبل میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے حالات و کوائف اجمالی طور پر بیان کر دیے جائیں تاکہ ان کی شخصیت کے رموز و نکات کو سمجھنے میں قدرے آسانی ہو۔ ریاست بہار میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جسے دیسنہ کہا جاتا ہے، نجیب اشرف ندوی صاحب وہیں کے ایک مشہور خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی کے انتہائی چہیتے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی کا تعلق بھی اسی شہرۂ آفاق گاؤں سے تھا۔ سید نجیب اشرف ندوی اور مولانا سید سلیمان ندوی ایک ہی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور آپس میں قریبی رشتے دار تھے۔ اس طرح وقت کی ان دو بڑی شخصیتوں نے اس چھوٹے سے گاؤں کو عالمی نقشے پر ایسا اجاگر کیا کہ اس کی روشنی سے علمی و ادبی دنیا منور ہو گئی۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی اور مشہور مورخ اور ادیب سید صباح الدین عبدالرحمٰن بھی اسی چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے اور خانوادۂ مولانا سید سلیمان ندوی کے ممتاز افراد میں شامل ہوئے۔ سید نجیب اشرف ندوی کے والد محترم ڈاکٹر سید معین مہاراشٹر کے ضلع چاندہ کے ایک مقام آرموری میں سرکاری ڈاکٹر تھے۔ سید نجیب اشرف ندوی یہیں پر ۶ جون ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے۔ اگر کوئی شخص ایک مخصوص صوبے کے کسی مقام پر پیدا ہو کر وہاں کا شہری کہلانے کا حق دار بن سکتا ہے تو سید نجیب اشرف ندوی بلاشبہ مہاراشٹرین کہلانے کے حق دار تھے۔ مہاراشٹر اور مہاراشٹر کے لوگوں کو بجا طور پر اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ سید نجیب اشرف ندوی کے خمیر میں یہاں کی مٹی کی خوشبو شامل تھی۔

راقم الحروف سید نجیب اشرف ندوی مرحوم سے بہت قریب تھا۔ جب وہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کے ڈاکٹر تھے تو اسی زمانے میں ۱۹۶۸ میں، میں نے اس شہرۂ آفاق ادارے سے اردو اور فارسی میں ایم اے کیا تھا۔ نجیب اشرف ندوی صاحب کے عہدِ نظامت میں ممبئی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم نہیں ہوا تھا لہٰذا یونیورسٹی کے اربابِ بست وکشاد نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ وہ ایم اے کی کلاسیں چلائے۔ ایم اے میں میرا داخلہ کافی مشکل سے ہو رہا تھا، اول تو میں اپنے وطن اعظم گڑھ سے کافی تاخیر سے ان کے پاس پہنچا تھا، دوسرے میں نے اسکول اور کالج میں اردو بھی کہیں نہیں پڑھی تھی، لیکن ندوی صاحب نے جب ممبئی یونیورسٹی کے رجسٹرار کو یہ لکھ کر دیا کہ انھیں میری علمی استعداد اور اردو، فارسی کی لیاقت اور معلومات پر پورا اعتماد ہے تو ایم اے میں میرا داخلہ آسان ہو گیا۔ چناں چہ آج اگر میں ایم اے ہوں تو اس کا سہرا ندوی صاحب کے ہی سر بندھتا ہے۔

ایک بار ندوی صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ کیا وہ ندوہ میں صرف پیدا ہوئے یا وہاں کسی کلاس تک تعلیم بھی حاصل کی؟ تو میرے اس استفسار پر سید نجیب اشرف ندوی صاحب نے مجھے بتایا کہ ابتدائی دینیات کی تعلیم انھوں نے آرموری میں مراٹھی میڈیم سے حاصل کی اور ورناکیولر کا فائنل امتحان بھی انھوں نے مراٹھی ذریعہ تعلیم سے ہی پاس کیا۔ ندوی صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ۹ سال کی عمر میں انھیں ندوۃ العلما بھیجا گیا۔ اس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی ندوے میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ نجیب اشرف ندوی صاحب کی خوش بختی تھی کہ وقت کی دو یگانۂ روزگار شخصیتوں علامہ شبلی نعمانی اور ان کے شاگردِ خاص سید سلیمان ندوی نے ان کی ذہنی و فکری تربیت کی۔ شبلی نعمانی مرحوم نے اپنے قیامِ ندوہ کے دوران سید نجیب اشرف ندوی کو بلوغ المرام کا درس بھی دیا۔ شبلی نعمانی کی تربیت میں دن گزارنے والے کسی شخص کی قسمت کی روشنی اور درخشانی کا کیا کہنا۔ شبلی نعمانی جیسے عظیم انسان کا نام جب زبان پر آتا ہے تو ذہن میں یہ شعر گونجنے لگتا ہے کہ:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

ہماری بدقسمتی کہ مولانا شبلی قلیل الحیات (Short Lived) ثابت ہوئے، لیکن اس مختصر سی زندگی میں بھی انھوں نے جو علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی کام کیا اس کی مثال ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ ہم دراصل سید نجیب اشرف ندوی صاحب کی تعلیم وتربیت کی بات کر رہے تھے اور ذکر چھڑ گیا ان کے استاد مولانا شبلی نعمانی کا، لیکن ذکرِ شبلی تو خیر و برکت کا سرچشمہ ہے۔ بہرحال آیئے پھر اصل موضوع پر۔ آرموری کی اسکولی تعلیم اور بعد ازاں گھر کی اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم کے بعد انھوں نے اگرچہ ندوے میں داخلہ لے لیا تھا لیکن زیادہ دنوں تک وہ وہاں ٹھہر نہیں سکے کیوں کہ ان کے اندر انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی للک اور امنگ نے زور پکڑ لیا تھا، چناں چہ وہ اس کی طرف مستعدی سے راغب ہو گئے۔ یہ ۱۹۱۲ کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ اس وقت تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کا بڑا زور وشور تھا۔ اس زور وشور کا حاصل یہ نکلا کہ ندوی صاحب سیاست سے وابستہ ہو گئے، لیکن سیاست سے ان کی وابستگی ان کی علمی و ادبی مصروفیت پر اثر انداز نہیں ہوئی۔

ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ ندوی صاحب بہ غرضِ تعلیم ندوۃ العلما گئے تھے لیکن وہاں سے ۱۹۲۰ کے آس پاس علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے ایما پر دارالمصنفین اعظم گڑھ چلے آئے۔ یہاں کے دوران قیام بھی اگرچہ ان کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹا تو نہیں لیکن قدرے تعطل ضرور واقع ہوئی، وہ اس طرح کہ تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات میں سرگرم حصہ لینے کے سبب تعلیم کا یہ سلسلہ مستقل طور پر جاری نہیں رہ پاتا تھا، لیکن چوں کہ تعلیم کے حصول کا جذبہ ان کے اندر موجود تھا ہی اس لیے تعلیم کی ٹوٹی کڑیوں کو وہ جوڑنے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ بار بار کلکتہ جاتے تھے، یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ اپنی ان کوششوں سے کسی نہ کسی طرح ۱۹۲۶ میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے امتیاز کے ساتھ پاس کر لیا۔ اچھے نمبروں سے ایم اے کرنے کے عوض انھیں کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے طلائی تمغہ تو حاصل ہوا ہی ساتھ ہی ساتھ انھیں وہاں سے ۱۰۰ روپے کی قیمتی کتابیں بھی بطور انعام حاصل ہوئیں۔ اس انعام سے انھیں بے پناہ خوشی حاصل ہوئی۔

ندوی صاحب نے اپنی عمر کے آخری دنوں میں انگریزی میں اپنا Bio-data تیار کیا تھا۔ ایک دن پتا نہیں انھوں نے کس خیال اور مقصد کے پیشِ نظر اس کی ایک کاپی میرے حوالے کر دی۔ اس بایوڈیٹا پر میں نے نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ اس میں ان کے تعلق سے ساری تفصیلات تو ہیں لیکن تاریخِ وفات کی جگہ خالی ہے۔ ۵؍ دسمبر ۱۹۶۸ کو ان کا جب انتقال ہوا تو میں نے اپنے سوگوار قلم سے اس جگہ کو پُر کر دیا۔ اس طرح ندوی صاحب کے سوانحی کوائف پوری طرح مکمل ہو گئے۔ ان کی وفات حسرت آیات کے کئی سال بعد کریم نگر (آندھرا پردیش) کے ریاست علی تاج نے ایم اے کے ایک پرچے کے سلسلے میں ندوی صاحب پر مقالہ لکھا تو میرے پاس موجود اس سوانحی کوائف سے پورا پورا استفادہ کیا۔ اپنے مقالے میں ایک دیانت دار اور منصف مزاج مصنف کی حیثیت سے اس کا ذکر ریاست صاحب نے بار بار کیا ہے ورنہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے تعاون واشتراک کا لوگ ذکر تک نہیں کرتے۔ ریاست علی تاج صاحب کا ندوی صاحب پر لکھا ہوا یہ تحقیقی مقالہ بہت جامع، مدلل اور پُر از معلومات ہے۔ یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کے لیے لکھے جانے والے مقالوں سے یہ بدرجہا بہتر مقالہ ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر مسعود حسین خاں جیسے نامی گرامی پروفیسروں کی مثبت رائیں اس تحقیقی مقالے کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرتی ہیں۔

اچھا تو اب ہم ندوی صاحب کے کارناموں پر قدرے تفصیل سے نظر ڈالتے ہیں۔ ندوی صاحب کو قریب سے جاننے والوں کا کہنا ہے کہ وہ شروع سے بڑے ذہین، طباع اور محنتی تھے۔ انھوں نے فارسی کی اس مشہور کہاوت کو گرہ میں باندھ لیا تھا کہ ”کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی“ یعنی کسی ہنر میں کمال حاصل کرو تاکہ تم دنیا میں ہر دل عزیز رہو۔ اول تو نجیب اشرف ندوی صاحب کے پاس کام کرنے کا جذبہ تھا، اس پر دارالمصنفین کے سازگار ماحول نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ان کا قلم بڑی تیزی سے چل پڑا۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مدیر ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ نے ان کے انتقال کے بعد اپنے اداریے میں لکھا تھا کہ ”نجیب اشرف ندوی صاحب کے لکھنے پڑھنے کا طریقہ بڑا انوکھا تھا۔ وہ رات کو کافی دیر تک بیٹھتے تھے اور حقے کے کش کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے تھے“۔ دارالمصنفین کے قیام کے دوران انھوں نے ہندستان کے اسلامی عہد پر کافی گہرا اور وسیع مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اس مخصوص عہد کے کچھ بہت متنازع فیہ مسائل پر قلم اٹھایا تو تاریخ نگاری کا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے بے شمار علمی اور ادبی اور تحقیقی گتھیوں کو سلجھانے کا بھی کام کیا۔

دارالمصنفین کے دوران قیام ویسے تو انھوں نے بہت سے اہم اور نمایاں کام کیے لیکن ان کے کچھ کام تو ایسے ہیں جنھیں کسی صورت سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ایسے منفرد کاموں میں مغل سلطنت کے مشہور حکمراں اورنگ زیب عالمگیر کے رقعات کو جمع و مرتب کرنے کا کام شامل ہے۔ اورنگ زیب کے رقعات کو مرتب کرنے کا کام انھوں نے ایشیا کے بہت ہی مشہور مورخ سر جادو ناتھ سرکار کی سرپرستی اور رہنمائی میں کیا۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگرچہ سر جادو ناتھ سرکار اورنگ زیب عالمگیر کی شخصیت اور ان کی حکمرانی کے طریقوں اور اصولوں سے خوش نہیں تھے لیکن اس کے باوجود سید نجیب اشرف ندوی مرحوم نے ان کی رہنمائی میں کام کرنے سے گریز نہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ سر جادو ناتھ سرکار کے نادر و نایاب اور انتہائی طور پر بیش قیمت کتب خانے میں دستیاب کتابوں اور جرائد اور ان کے سینے میں محفوظ معلومات کے خزینوں سے وہ حتی المقدور استفادہ کرنا چاہتے تھے۔ ندوی صاحب نے اس کام کو شوق اور سرگرمی سے انجام دیا۔ سر جادو ناتھ سرکار بھی چوں کہ بڑے دل و دماغ کے انسان تھے اس لیے ندوی صاحب کے کام میں بے جا مداخلت اور رخنہ اندازی سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ ان کی اول درجے کی رواداری تھی۔

'رقعاتِ عالمگیر' کی اشاعت

سید نجیب اشرف ندوی صاحب کا ایک بے مثال اور تاریخی اہمیت کا کارنامہ تھا۔ لیکن اس سے بھی بڑا ان کا وہ کام تھا جو اس پر ایک طویل و بسیط مقدمے کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ دونوں تاریخی کتابیں جب چھپ کر منظرِ عام پر آئیں تو سید نجیب اشرف ندوی مرحوم کو بے پناہ داد و تحسین ملی۔ دارالمصنفین کے سلسلۂ مطبوعات میں یوں تو اچھی اور قابلِ قدر کتابوں کی بہتات ہے لیکن ندوی صاحب کی یہ دونوں کتابیں یعنی 'رقعاتِ عالمگیر' اور 'مقدمہ رقعاتِ عالمگیر' اپنی مثال آپ ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے اورنگ زیب عالمگیر پر جو کتاب لکھی ہم ان دونوں کتابوں کو اس سے بڑی تو نہیں لیکن اس کی توسیع یقیناً سمجھتے ہیں۔ مولانا شاہ معین الدین احمد نے 'مقدمہ رقعاتِ عالمگیر' کے بارے میں لکھا تھا کہ ”یہ مقدمہ عربی فارسی انشا اور اورنگ زیب کی انشا کی خصوصیات اور اس کی شہزادگی کے زمانے کی نہایت مستند تاریخ ہے“۔ تاریخی موضوعات پر قلم بند کی گئی کتابوں میں عام طور پر تحریری دلکشی اور دل آویزی کا اہتمام بڑا مشکل ہوتا ہے لیکن 'مقدمہ رقعاتِ عالمگیر' میں سید نجیب اشرف ندوی صاحب نے عمدہ اور رواں نثر نگاری کا مظاہرہ پیش کیا ہے۔

سید نجیب اشرف ندوی نے قیام دارالمصنفین کے دوران ماہنامہ 'معارف' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض انجام دیے۔ اپنی اس حیثیت کو موثر بنانے کی غرض سے وہ 'معارف' میں نادر اور بیش بہا عنوانات پر مضامین و مقالات لکھتے رہتے تھے۔ مذکورہ ماہنامے میں قلم بند کیے گئے ان کے کچھ مقالات کے نام اس طرح ہیں: 'ہاتھ یا ہاتھا'، 'دیوانِ حافظ اور سلاطینِ مغلیہ'، 'ہند عہدِ اورنگ زیب میں'، 'تاریخ الدولتین'، 'پنجاب میں اردو'، 'اورنگ زیب اور مراد'، 'اوبلی لائبریری پٹنہ کا کیٹلاگ'، 'انڈیا آفس لندن کا کیٹلاگ' اور 'افغانستان اور سنٹرل ایشیا' وغیرہ۔ ان مقالات کے عنوان سے ہی ان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ندوی صاحب کے ان مقالات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں حشو و زوائد کا گمان کہیں نہیں گزرتا، چوں کہ ان مقالات کا تعلق تاریخ سے ہے اس لیے حق اور سچائی کی بازیافت کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

ماہنامہ 'معارف' میں شائع ہونے والے ان مقالات کے علاوہ انھوں نے ملک کے کچھ دوسرے موقر اور معیاری رسائل میں بھی مقالے لکھے۔ ان کے ایسے مقالوں کے عنوانات اس طرح ہیں: 'بہار میں اردو' (اردو اورنگ آباد)، 'ہندستانی ادب' (ہمایوں، لاہور)، 'سوری خاندان کے عہد کا بہار' (ماہنامہ 'زمانہ' کانپور)، 'تاریخ اور اس کے ماخذ' (الناظر، لکھنؤ)، 'ہندستان میں صحافت' (نیرنگِ خیال، لاہور)، 'خاقانی بحیثیت قصیدہ گو' (جامعہ، دہلی)، 'اورنگ زیب کی ڈائری'

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دنیا

معلم اردو کی تربیت سرکاری اداروں کی تربیت کے مساوی

ہائی کورٹ

لکھنؤ (۳ دسمبر)۔ ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ نے اپنے ایک اہم فیصلے میں کہا کہ معلم اردو کی تربیت بھی سرکاری اداروں کی تربیت کے مساوی ہوگی۔ یہ حکم جسٹس وشنو چندر گپتا نے امبیڈکر نگر کے کھمباپور کے آدرش بالیکا ودیالیہ کی ایک استانی اختر النساء کی رٹ پر ان کے وکیل مشتاق احمد صدیقی کی بحث کے بعد دیا۔ بحث میں کہا گیا کہ اختر النساء کا بی ایس اے امبیڈکر نگر کے ذریعے اس اسکول میں استانی کی حیثیت سے سلیکشن ہوا اور شروع میں اس نے جامعہ اردو کی معلم اردو کی سند دی اور اس پر درخواست دہندہ کی تقرری بھی ہوگئی اور وہ اپنے عہدے پر کام کرنے لگی۔ ۲۰۰۶ میں اس اسکول کو سرکاری گرانٹ ملی، جب اختر النساء کی سرکاری تنخواہ کو بی ایس اے نے منظوری نہیں دی اور کہا کہ درخواست دہندہ کی تعلیمی لیاقت کم ہے۔ بی ایس اے نے یہ بھی کہا کہ ۱۱ راگست ۱۹۹۷ کے جی او سے جامعہ اردو سے معلم کی منظوری ختم کردی گئی ہے۔ درخواست دہندہ کے وکیل مشتاق احمد صدیقی نے بحث میں کہا کہ اختر النساء کو بی ایس اے امبیڈکر نگر نے ملازمت دینے کی منظوری دی تھی، وہ آج تک مسترد نہیں کی گئی ہے اور اب تک اختر النساء وہیں کام کررہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی حکومت کا ۱۱ راگست ۱۹۹۷ کا جو حکم ہے وہ سرکاری اسکولوں کے لیے ہے اور جو اسکول صرف سرکار سے تسلیم شدہ ہیں ان پر یہ حکم نافذ نہیں ہوتا۔ مسٹر صدیقی نے بحث میں مزید کہا کہ معلم اردو کو ریاستی حکومت نے ۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۸ اور ۱۳ر ستمبر ۱۹۹۴ کے مطابق بی ٹی سی کے برابر تسلیم کیا ہے اور ان احکام کو نہ تو واپس لیا گیا اور نہ ہی اس کو کالعدم کیا گیا ہے۔ عدالت نے اس دلیل کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ اختر النساء کو دوسرے اساتذہ کی طرح سرکاری تنخواہ دی جائے اور اب تک کی بقایا ۹ فیصد سود کے ساتھ دی جائے۔ (اردو ایکشن، بھوپال)

حکومت اردو اسکولوں کی بدحالی کی طرف توجہ دے

کرناٹک کے اردو قلم کاروں کا مطالبہ

بنگلور (یکم دسمبر)۔ کرناٹک کے اردو قلم کاروں کی کانفرنس میں ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ حکومت سرکاری اردو اسکولوں کی بدحالی کی طرف توجہ دے، اردو اسکولوں میں کنڑا ٹیچروں کا تقرر کرے اور کرناٹک اردو اکادمی کی طرف سے بزرگ قلم کاروں کو وظیفہ اور میڈیکل ایڈ فراہم کرے۔ آج یہاں دارالعلوم سبیل الرشاد میں قلم کاروں کی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں کرناٹک کے مختلف علاقوں اور اضلاع سے آئے قلم کاروں نے شرکت کی۔ کانفرنس کے اختتام پر ایک قرارداد منظور کی گئی، جس میں قلم کاروں کی ایک مرکزی انجمن کا قیام، بنگلور میں اردو ہال کا قیام، حکومت کی طرف سے دیے جانے والے راج اُتسو ایوارڈز میں اردو قلم کاروں کی شمولیت، ساہتیہ اکادمی کی طرف سے اردو کتابوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ وغیرہ مطالبے شامل ہیں۔ اس موقع پر مفتی محمد اشرف علی نے صدارتی خطاب میں اہل قلم حضرات کو آواز دی کہ وہ معاشرے میں پھیلی برائیوں کے خلاف اپنے قلم کو استعمال کریں۔ ظلم اور نفرت کے خلاف آواز بلند کریں۔ اپنے قلم کو صحیح استعمال کریں، کسی کی عزت پر حملہ نہ کریں، کسی کے دل کو مجروح نہ کریں۔ اس موقع پر مولانا راہی فدائی، جناب اعظم شاہد، جناب عزیز اللہ بیگ، جناب عظمت اللہ، وہاب عندلیب، جناب غضنفر اقبال، جناب شفیق عابدی، جناب سید شفیع اللہ، فیاض قریشی، جناب عبدالحمید اور جناب ضیا کرناٹکی وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب یمین منور نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(سالار، بنگلور)

اردو کے مسائل پر توجہ دینے کی ضرورت

لکھنؤ (۳ دسمبر)۔ گورنر اتراکھنڈ ڈاکٹر عزیز قریشی کے اعزاز میں سابق ایم ایل اے حاجی محمد رفیع صدیقی کی رہائش گاہ اشرف آباد میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس میں ایک مختصر شعری نشست بھی ہوئی۔ اس موقع پر ڈاکٹر عزیز قریشی نے کہا کہ ملکی سطح پر اردو کے مسائل پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ قومی یک جہتی کو فروغ دینے والی اردو زبان کو اُس کا حق نہیں ملا ہے۔ اس کے بعد شعری نشست منعقد ہوئی، جس میں وسیم بریلوی، رضوان احمد (ڈی آئی جی ریلوے)، پروفیسر خان محمد عاطف اور شکیل گیاوی نے اشعار پیش کیے۔

(آگ، لکھنؤ)

دفاتر میں دوسری سرکاری زبان اردو کا استعمال نہ ہونا باعث تشویش

جالے، بہار (۷ دسمبر)۔ راشٹریہ جنتا دل کے بلاک صدر اہل مشرا کی صدارت میں منعقد میٹنگ میں ضلع جنرل سکریٹری جمال اظہر روحی نے کہا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنے کے باوجود بھی ریاستی حکومت اس کی اہمیت کو نہیں سمجھ رہی ہے۔ آج بلاک، سرکل اور تھانے میں لگے اطلاعاتی نوٹس میں کہیں بھی اردو کا استعمال نہیں ہونا فکر کی بات ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

وسیم افتخار انصاری برہانپوری کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

اندور۔ جناب وسیم افتخار انصاری برہان پوری کو دیوی اہلیہ یونی ورسٹی، اندور نے ان کے تحقیقی مقالے "[illegible] اردو نثر نگاری" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔ انھوں نے اپنا یہ مقالہ ڈاکٹر صدیقہ انصاری (صدر شعبۂ اردو، موہن لال سکھاڑیا یونی ورسٹی، اودے پور، راجستھان) کی نگرانی میں قلم بند کیا ہے۔

تجربہ کار اردو اساتذہ کو ٹرینڈ زمرے میں شامل کیا جائے

سہارنپور (۱۱ دسمبر)۔ آج یہاں شکشک سنگھ کے بینر تلے سیکڑوں اساتذہ نے ضلع کلکٹریٹ پر دھرنا دیا اور مظاہرہ کیا۔ شکشک سنگھ کی طرف سے 21 نکات پر مشتمل میمورنڈم وزیر اعلا کے نام ڈی ایم کے توسط سے بھیجا گیا جس میں پانچ سال سے تدریسی خدمات انجام دے رہے اردو اساتذہ کو ٹرینڈ اساتذہ کا درجہ دیے جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ آج کے اس دھرنے میں اتر پردیش اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن بھی شریک تھی۔ ایسوسی ایشن کے صوبائی جنرل سکریٹری راؤ عبدالستار نے کہا کہ یہ صریحاً ناانصافی ہے کہ جو اساتذہ گزشتہ پانچ برس سے اردو پڑھا رہے ہیں انھیں ان کی محنت کا پورا حق نہ ملے اور ان کو ٹرینڈ اساتذہ کے زمرے میں شامل نہ کیا جائے۔ مظاہرے میں شریک اساتذہ نے وزیر اعلا سے ٹیچرس کی پنشن بحال کرنے اور سبکدوش یا فوت ہونے والے ٹیچر کی جگہ وارثین میں سے کسی ایک کو ٹیچر رکھے جانے، پرانے اساتذہ اور نئے اساتذہ کا مشاہرہ مساوی کرنے، پچاس فیصد مہنگائی بھتہ کو مشاہرہ کے اسکیل میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس مظاہرے میں اردو اساتذہ سمیت تمام پرائمری اور جونیئر اسکولوں کے اساتذہ شریک تھے، جن کی قیادت شکشک سنگھ کے کنوینر وی کے اگروال نے کی۔ مظاہرے میں ماسٹر محمد اکبر، چاند میاں انصاری، شمشاد قمر، محمد کامل، عبدالحق غوری، اسلام الرحمٰن، محمد وسیم، کیلاش شرما، سینھ پال اور سریندر شرما وغیرہ شریک ہوئے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

بزم اردو ناگپور کی ماہانہ نشست

ناگپور (پریس ریلیز)۔ کالج کے اردو، عربی اور فارسی کے اساتذہ کی انجمن 'بزم اردو ناگپور' کے زیر اہتمام ایک ماہانہ نشست ۲۳ر نومبر ۲۰۱۳ کو منعقد کی گئی، جس میں مختلف کالجوں کے اساتذۂ کرام نے شرکت کی۔ نشست کی صدارت ایس. کے. پوروال، کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اظہر ابرار نے کی۔ نشست کے آغاز میں ڈاکٹر انجم آرا نے اپنا مقالہ 'اردو غزل کا ارتقا عہد بہ عہد' پیش کیا۔ پروفیسر ریشما ترنم نے 'سرسید احمد خاں کی تعلیمی خدمات' پر مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر محمد اسرار نے 'دور حاضر میں جدید اردو شاعری کا ارتقا' عنوان سے معلوماتی مضمون سنایا۔ آخر میں ناگپور یونی ورسٹی میں اردو بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئرمین ڈاکٹر اظہر حیات نے دو مختصر افسانے پیش کیے۔

آخر میں صدر محفل نے مقالوں پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا۔ نظامت کے فرائض محمد اسرار نے انجام دیے۔ اس بزم میں ڈاکٹر ناہید سوری، ڈاکٹر صبیحہ خورشید، ڈاکٹر صبیحہ کوثر، محترمہ بصیرہ مومن، پروفیسر نصرت مینو اور پروفیسر شبینہ مشتاق کے ہمراہ کثیر تعداد میں محبان اردو نے شرکت فرمائی۔

کنڑا امتحان پاس اردو ٹیچرس کے لیے ایک انکریمنٹ منظور

بنگلور (۳ دسمبر)۔ گروہن پالیہ اردو اسکول کے سابق اردو ٹیچر شیخ عظیم الدین نے اطلاع دی ہے کہ آخر کار ڈی ڈی پی آئی، محکمۂ تعلیم نے ۱۰ر جنوری ۱۹۷۴ء سے ۲ر ستمبر ۱۹۸۷ کے درمیان اردو ٹیچرس کے عہدے پر رہ کر کنڑا امتحان پاس کیے ہوئے تمام اردو ٹیچروں کو ایک افزود انکریمنٹ کا اعلان کیا ہے۔ واضح ہو کہ ۱۹ر ستمبر ۲۰۱۳ کو شیخ عظیم الدین اور چند دوسرے کنڑا امتحان پاس کیے ہوئے اردو ٹیچروں نے سکریٹری محکمۂ تعلیم سے شکایت کی تھی کہ اردو اسکولوں میں کام کررہے اردو ٹیچرز جنھوں نے سروس کے دوران کنڑا امتحان پاس کیا ہو انھیں ایک افزود انکریمنٹ دیا جائے۔ اس سلسلے میں کاروائی کرتے ہوئے ڈائرکٹر پرائمری تعلیم نے ۲۵ر نومبر کو ڈی ڈی پی آئی کو خط لکھ کر حکومت کے جی او نمبر ED356 PBS2012 مورخہ 7-10-13 کے تحت 10-01-1974 تا 02-09-1987 کے دوران کنڑا امتحان پاس کیے ہوئے اردو اسکولوں کے ٹیچروں کو ایک افزود انکریمنٹ دینے کی ہدایت دی۔ اس میعاد میں کنڑا امتحان پاس کیے ہوئے اردو ٹیچرس اب یہ سہولت حاصل کرسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں جی او لیٹر کی نقل یا مزید تفصیلات کے لیے شیخ عظیم الدین سے فون نمبر 9845621261 پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

(سالار، بنگلور)

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ایم کاویانی کا مضمون 'مولانا آزاد کے ایک اہم عصر مولانا دریابادی'

گرامی قدر! ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے ۱۵ تا ۲۱ نومبر ۲۰۱۳ کے شمارے میں ایک اہم مضمون 'مولانا آزاد کے ایک اہم عصر مولانا دریابادی' نظر نواز ہوا، جس کو جناب ایم کاویانی (ممبئی) نے تحریر کیا ہے۔ مضمون نہایت ہی فکر انگیز اور ماضی قریب کی ادبی تاریخ کا منصفانہ تذکرہ ہے، جس کو پڑھنے کے بعد کسی کو بھی کسی کوئی غلط فہمی کا اندیشہ نہیں رہے گا۔ بیسویں صدی کے اکابرین مولانا آزاد، مولانا ماجد دریابادی، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا محمد علی کے افکار و نظریات کو ایم کاویانی صاحب نے بہت ہی ایمان داری کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

'Pain and Pleasure' کے اردو ترجمے کے سلسلے میں مولانا آزاد اور مولانا ماجد دریابادی میں ادبی چشمکیں ہوتی رہی ہیں (لذت و الم، حظ و کرب) اگر وہ بھی ان کے درمیان ذاتی و نظریاتی رقابت کا مسئلہ نہ بنا۔ جب مولانا ماجد دریابادی لکھنؤ سے کلکتہ پہنچتے ہیں تو مولانا آزاد کے مہمان بنتے ہیں اور اعلا درجے کی مہمان نوازی پاتے ہیں، جس کو خود مولانا ماجد دریابادی کے لفظوں میں "میزبان نے اکرام مہمان کا پورا حق ادا کر دیا"۔ جب کہ طنز کے ایک تیر چلانے والے اکبر الہ آبادی نے بھی مولانا کی اردو نگاری کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

عبدالواحد خاں
راجیو نگر III اسٹیج، میسور، کرناٹک

فیروز آباد میں اردو سے ایم اے کرنے کے لیے کوئی کالج نہیں

فیروز آباد (۳ دسمبر)۔ مسلم کلیان اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کی ایک نشست مولانا آزاد اسوان انٹر کالج میں منعقد کی گئی، جس میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر یونیورسٹی، جس کا سابقہ نام آگرہ یونیورسٹی تھا، کے ذریعے اردو کو نظر انداز کیے جانے پر اعتراض جتایا گیا۔ سوسائٹی کے سکریٹری احمد اسامہ نے اپنے خطاب میں کہا کہ شہر فیروز آباد میں اردو سے ایم اے کرنے کے خواہاں طلبہ کے لیے ایسا کوئی کالج، یونیورسٹی نہیں ہے جہاں سے وہ اردو میں ایم اے کر سکیں۔ لڑکے جو بہت زیادہ خواہش مند ہوتے ہیں وہ علی گڑھ، کانپور یا پھر الہ آباد وغیرہ چلے جاتے ہیں۔ لیکن آگرہ یونیورسٹی نے جب ان طلبہ کی یہ خواہش پوری کی تو فیروز آباد کے طلبہ کے لیے آگرہ کی مسافت بہ نسبت الہ آباد، کانپور اور علی گڑھ کے کافی آسان تھی، پھر جن طلبہ کو آگرہ تک جانے کی اجازت والدین سے نہیں ملی انھوں نے پرائیویٹ فارم بھر کر اردو سے ایم اے کرنے کی اپنی خواہش پوری کی، یہاں تک کہ زیادہ مانگ بڑھنے پر شہر کے کچھ کتب فروش آگرہ یونیورسٹی کا فارم فروخت کرنے لگے، جہاں سے فارم خرید کر طلبہ اردو میں ایم اے کرنے لگے لیکن گزشتہ سال کتب فروشوں کے یہاں صرف ایم اے اردو فائنل کا ہی فارم دستیاب رہا، یعنی ایم اے فرسٹ ایئر جو طلبہ کر چکے تھے ان کے لیے تو فارم دستیاب تھا، لیکن جو نئے طلبہ ایم اے کرنے کے خواہاں تھے ان کے ہاتھ مایوسی لگی، چوں کہ آگرہ یونیورسٹی کی جانب سے اس سلسلے میں کوئی اطلاع بھی نہیں دی گئی تھی اس لیے صرف انتظار میں ہی طلبہ کا پورا سال نکل گیا یا یوں کہا جائے کہ بے کار چلا گیا۔ اب نئے سیشن میں ایک بار پھر طلبہ کتب فروشوں کے چکر لگانے شروع کیے ہیں، لیکن ابھی بھی ان کے ہاتھ مایوسی ہی لگ رہی ہے۔ سدھیر بک ڈپو نام کے کتب فروش کا کہنا ہے کہ شاید یونیورسٹی نے اردو سے ایم اے کرانا بند کر دیا ہے، ایسا اس لیے محسوس ہوتا ہے کیوں کہ گزشتہ سال صرف ایم اے فائنل کا فارم بازار میں دستیاب ہو سکا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ امسال کوئی بھی ایم اے اردو سال اول کا طالب علم نہیں ہوگا اور چوں کہ ایم اے اردو سال اول کا فارم گزشتہ سال بھی نہیں آیا تھا تو امسال تو نہ ایم اے سال اول کا فارم آتا ہے اور نہ ہی سال دوم کا۔ محمد مقصود نے اردو کے ساتھ کی جا رہی اس ناانصافی پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ یونیورسٹی نے طلبہ کا پورا ایک سال برباد کر دیا اور کسی نے اس کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کی۔

(انقلاب، دہلی)

اردو میں جے ای ای مین کا امتحان بھی دیا جا سکے گا

نئی دہلی (۲۳ نومبر)۔ انجینئرنگ میں داخلے کے لیے ہونے والے جے ای ای مین کا امتحان گجراتی، مراٹھی اور اردو میں بھی دیا جا سکے گا۔ گجرات، دمن دیو اور دادر اور نگر حویلی علاقے میں پڑھنے والے امتحان مراکز پر ہندی، انگریزی کے ساتھ ساتھ گجراتی میڈیم میں امتحان دینے کا اختیار ہوگا، وہیں مہاراشٹر کے مراکز میں امتحان دینے والے انگریزی، ہندی کے ساتھ ساتھ اردو اور مراٹھی میں بھی امتحان دے سکتے ہیں۔ یہ سہولت آن لائن امتحان کے لیے ہی ملے گی۔ امیدوار امتحان کے دوران چاہے تو اپنا میڈیم تبدیل کر سکتے ہیں۔ آن لائن امتحان میں امیدواروں کو ایک سہولت اور ملے گی، مثلاً انگریزی میڈیم منتخب کر چکے طالب علم امتحان کے دوران کسی بھی سوال کو ہندی میں دیکھ کر اپنے جواب کو ٹھیک بھی کر سکتے ہیں۔

(اخبار مشرق، کلکتہ)

کارپوریشن بجٹ میں اردو میڈیم اسکولوں کے لیے علاحدہ فنڈ مختص نہیں کیا گیا تھا

میناکشی بنرجی

کلکتہ (۲۶ نومبر)۔ کلکتہ میونسپل کارپوریشن کے بجٹ میں اردو میڈیم اسکولوں کے لیے الگ سے کوئی فنڈ مختص نہیں کیا گیا تھا۔ آج ہاؤس میٹنگ میں سی پی ایم کونسلر سوئی گھوش نے سوال کیا کہ ۲۰۱۳-۱۴ کے دوران آٹھ اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی تجویز تھی، لیکن اب تک کتنے قائم کیے جا چکے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں میئر ان کونسل ایجوکیشن جتالی بنرجی نے کہا کہ ۲۰۱۳-۱۴ کے بجٹ میں اردو میڈیم کے لیے علاحدہ بجٹ مختص نہیں کیا گیا تھا۔ بجٹ میں ملٹی سیکٹورل ڈیولپمنٹ پروجیکٹ (ایم ایس ڈی پی) کے تحت اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی بات کہی گئی تھی جو کہ مرکزی اور ریاستی پالیسی ہے اس کا کارپوریشن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (اخبار مشرق، کلکتہ)

آندھرا پردیش میں اردو کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ

حیدرآباد (۲۰ نومبر)۔ آندھرا پردیش میں کانگریس پارٹی کی حکومت قائم ہے، اس کے باوجود سکریٹریٹ کے ساتھ ہی محکموں میں اردو ندارد ہے یہاں تک کہ خود کانگریس پارٹی کے صدر دفتر گاندھی بھون میں موجودہ عہدیداروں کے علاوہ تمام کی نام کی تختیاں تلگو میں موجود ہیں۔ جناب کلیم الدین قریشی نے صدر پردیش کانگریس جناب بی ستیہ نارائنا کو یادداشت پیش کرتے ہوئے اردو سے انصاف کی خواہش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاست میں دوسری سرکاری زبان اردو ہے لیکن سرکاری دفاتر میں اس کا چلن نہیں ہے جب کہ اردو تنظیموں کی جانب سے اردو کے حقیقی مقام کے حصول کے لیے جدوجہد جاری ہے۔ سلیم جنتی نے ریاستی حکومت اور صدر پردیش کانگریس سے مطالبہ کیا کہ وہ جلد از جلد اردو کے نام کی تختیاں اور محکموں کے بورڈز پر اردو تحریر کے لیے جی او جاری کریں۔

(رہنمائے دکن، حیدرآباد)

سرکاری دفاتر اور اہم مقامات پر اردو سائن بورڈ کے لیے مہم

حیدرآباد۔ آندھرا پردیش اردو کونسل کی نمائندگی پر ڈاکٹر ای ان منوہرن (جنرل منیجر اسٹیٹ بینک آف انڈیا) نے بینک کی قدیم ملک پیٹ شاخ پر بہت جلد اردو سائن بورڈ آویزاں کروانے سے اتفاق کر لیا ہے۔ اس ضمن میں کونسل کے صدر سید مجتبیٰ عابدی، محمد منیر قادری، ڈاکٹر عبدالساجد، سید شکیل عابدی اور آغا دوست علی نے نمائندگی کی تھی۔ مذکورہ قائدین نے کہا کہ کونسل کی جانب سے دیگر بینکوں، سرکاری دفاتر اور اہم مقامات پر اردو سائن بورڈ آویزاں کروانے کے لیے مہم شروع کی جائے گی۔ ان قائدین نے اردو اخبارات اور محبان اردو سے بھی خواہش کی ہے کہ اس مہم میں کونسل کا بھرپور تعاون کریں۔

(منصف، حیدرآباد)

کڑایہ روڈ (کلکتہ) کا اردو میڈیم پرائمری اسکول بند

کلکتہ (۲۳ اکتوبر)۔ کسی اردو میڈیم اسکول کو منظوری حاصل کرنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ ان حالات میں اگر کوئی اردو میڈیم اسکول بند ہوتا ہے تو اسے اردو داں طبقے کے لیے المیہ ہی کہا جائے گا۔ دراصل اراضی اور دوسرے مسائل پر انتظامیہ نے کڑایہ روڈ کے مدرسہ تعلیمات اسلامیہ (پرائمری سیکشن) کو آج سے بند کر دیا اور اسے رپن اسٹریٹ علاقے کے پیٹر فورڈ لین کے جینتیل ڈے اسکول میں ضم کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس اسکول میں چار اساتذہ تھے جن میں ہیڈ ماسٹر سمیت تین ٹیچر ریٹائر ہو چکے ہیں۔ فی الحال اسکول میں صرف ایک ٹیچر ہے۔ اسکول میں ۲۸ طلبہ تھے، انھیں بھی جینتیل ڈے اسکول منتقل کر دیا گیا ہے۔ مدرسہ تعلیمات اسلامیہ کی جگہ کو لے کر بھی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں، اس کے علاوہ اسکول میں صرف ایک ٹیچر مقرر ہونے سے اس کے ریگولر چلنے کو لے کر رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر کی جانب سے خالی جگہوں پر تقرری کی بھی کوشش کی گئی مگر شنوائی نہیں ہوئی جس کے نتیجے میں اسکول کو بند کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں اردو تحریک اور اردو دانشوروں کو بھی اپنی ذمے داری نبھانے کی ضرورت ہے۔

(اخبار مشرق، کلکتہ)

اک دیا اور بجھا

مراد آباد۔ مراد آباد کے بزرگ شاعر جناب اشتیاق حسین عرف وحشی مراد آبادی کا ۱۷ نومبر ۲۰۱۳ کو یہاں علالت کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ وہ 75 برس کے تھے۔ وحشی مراد آبادی کو اردو زبان و ادب سے بے حد لگاؤ تھا۔ مقامی سطح پر منعقد ہونے والے مشاعروں اور نشستوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے ساتھ ہی دیگر ادبی پروگراموں میں بھی وہ شرکت کرتے رہتے تھے۔

واضح رہے کہ گزشتہ ۱۳ نومبر کو مراد آباد کی دو ادبی شخصیات عبدالحمید شمسی اور خمار تہذیبی بھی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے اور اب وحشی مراد آبادی کے انتقال سے ایک بار پھر ادبی حلقے میں رنج و غم کا ماحول ہے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

کلکتہ۔ مغربی بنگال کے بزرگ اور استاد شاعر جناب کیف الاثر ۱۳ نومبر ۲۰۱۳ کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ 83 برس کے تھے۔ کیف الاثر غزل، رباعی، قصیدہ اور خاص طور پر نعتیہ قصائد میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ کیف الاثر صاحب کی پیدائش ۱۹۳۰ میں مٹیا برج (کلکتہ) میں ہوئی تھی۔ شاعری میں وہ علامہ اثر رودولوی سے اصلاح لیا کرتے تھے اسی نسبت سے وہ اثر تخلص کیا کرتے تھے۔ ۱۵ نومبر کو لال مسجد مٹیا برج میں ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور تدفین عمل میں آئی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : عرفان عباسی کے چند خاکے
مرتب : ڈاکٹر اسرار الحق قریشی
ضخامت : ۱۶۰ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتہ : دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی
razaksdab@gmail.com

اردو زبان و ادب میں فکشن اور نان فکشن کی تقسیم کے بعد سے جو سلسلہ چلا اُس میں مضمون نگاری پیش پیش رہی لیکن باوجود اس کے نان فکشن کی دوسری اصناف کے جلوے بھی اردو ادب میں جابجا بکھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ خاکہ نگاری بھی اس کی ایک خاص صنف ہے جس میں شعرا و ادبا کی سوانح اور تذکروں کا بنیادی رول ہے لیکن باضابطہ طور پر مرزا فرحت اللہ بیگ اور مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری کی بنیاد رکھی اور یہ سلسلہ خواجہ احمد عباس، احمد جمال پاشا، مالک رام اور مجتبیٰ حسین سے ہوتا ہوا عرفان عباسی تک پہنچا۔

عرفان عباسی کا تعلق لکھنؤ سے ہے، انھوں نے باضابطہ طور پر کوئی خاکہ نہیں لکھا بلکہ انھوں نے تذکرۂ شعرائے اترپردیش کی ۳۹ جلدیں لکھیں، ان کی اسی ادبی اور تحقیقی کوششوں کو ڈاکٹر اسرار الحق قریشی نے اپنی پارکھی نظر سے جانچا اور پرکھ کر ان کے اس مجر بکھراں سے خاکے کی شکل میں پکھ لعل و گہر تلاش کرکے اسے کتابی شکل میں مرتب کرکے قاری کے حوالے کردیا جو بلاشبہ ایک اہم کوشش ہے۔ بہ قول ڈاکٹر اسرار الحق قریشی: ''راقم الحروف نے ان کے تمام تذکروں کا مطالعہ کرکے یہ محسوس کیا کہ اگر ان میں سے شاعری پر تبصرے اور دیگر حضرات کے ضمنی حوالوں کو الگ کردیا جائے تو بعض تذکرے خاکے ہوسکتے ہیں۔ اس خیال کے پیش نظر ان تذکروں میں مجھے جہاں کہیں خاکے کی گنجائش نظر آئی میں نے انھیں علاحدہ کرکے اکابرینِ ادب کے خاکے مرتب کرلیے ہیں''۔

اردو ادب میں ڈاکٹر اسرار الحق قریشی نے اپنی تحقیقی کاوش سے نہ صرف ایک اضافہ کیا ہے بلکہ ایک نئی راہ بھی ہموار کی ہے جس پر چل کر کئی اور اضافے کیے جاسکتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں پیش گفتار اور تاثرات کے علاوہ گیارہ تاثراتی مضامین شامل ہیں جس میں عرفان عباسی کی تذکرہ نگاری، خاکہ نگاری اور حیات و خدمات کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں 'خاکے' کے ذیلی عنوان کے تحت ۲۸ خاکے مرتب کیے گئے ہیں جن میں پروفیسر سید احتشام حسین، شوکت تھانوی، شکیل الرحمٰن اعظمی، جگر مرادآبادی، اختر تلہری، سیماب اکبرآبادی، فانی بدایونی، نیاز فتح پوری، سالک لکھنوی، سراج لکھنوی، شفیق جونپوری، افسر میرٹھی، رشید صدیقی، خاموش غازی پوری، سید مسعود حسین مسعود، ذوقی رامپوری، فائز بہاری، ساغر نظامی، ادیب سیتاپوری، فراز بریلوی اور حسرت موہانی کے علاوہ دیگر شعرا و ادبا کے خاکے کو ڈاکٹر اسرار الحق قریشی نے بہ حسن و خوبی منتخب کرکے جہاں عرفان عباسی کے تخلیقی جولانیوں کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا ہے وہیں ایک اہم ادبی خدمت بھی انجام دی ہے۔

خاکہ نگاری کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قلمی تصویر ہے جس کا تانا بانا مصنف اپنے لفظوں کی نوک پلک کو درست کرکے قاری کے ذہن میں جو خیال ابھارتا ہے وہی تصویر خاکہ کہلاتی ہے جو قاری کو مطالعے کے دوران ہی عبارتوں کے سفر میں ابھر کر شخصیت سے روشناس کرا دیتی ہے۔ عرفان عباسی صاحب کا بھی یہ فنی کمال تھا کہ وہ سادہ اور سلیس زبان میں شعرا کی صورت، سیرت اور شاعری کے بارے میں جو تصویر کشی کی وہ مکمل اور دلچسپ ہوتی ہے، مثلاً حسرت موہانی کے خاکے کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''چھوٹا قد، منحنی جسم، بکھری ہوئی داڑھی، غیر جاذب چہرہ، کوتاہ گردن، عجیب سی مہین پھنسی پھنسی آواز جو بیک وقت حلق اور ناک سے نکلتی، ڈھیلی ڈھالی بوسیدہ اور میلی کچیلی مختلف رنگ کے دھاگوں سے گانٹھی ہوئی شیروانی، بغیر پھندنے کی کثیف ترکی ٹوپی، خاکی انگا اور ٹخنوں ٹخنوں پاجامہ، پیروں میں چمڑے کی سول چپل، آنکھوں پر ڈوری سے بندھی بیضاوی چشموں والی عینک، بائیں ہاتھ میں پرانی اور کئی تیلیوں سے الگ لٹکتے کپڑے والی چھتری، زانو پر کپڑے کا گندا سا تکیہ بھرا ہوا تھیلا، لوگ گھیرے تھے اور وہ سب سے مخاطب تھے''۔

عرفان عباسی کے انداز بیان، مشاہدات و تجربات کی بہترین سند ہیں، ان کے یہ تمام اقتباسات جو اب خاکے کی شکل میں اردو ادب میں شامل ہو گئے ہیں جس کا اعتراف ضرور کرنا چاہیے اور قریشی صاحب کی محنت، لگن اور انہماک کی بھی داد دینی چاہیے جنھوں نے اس نئے رنگ میں عرفان عباسی کو پیش کیا۔ امید کہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

⊙⊙⊙

بقیہ: رشید حسن خاں: بہ حیثیت مبصر

صفحہ ۸ سے آگے

وشافی شواہد پیش کیے ہیں جو معروضیت سے دور نہیں ہیں۔ اس تبصرے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امرواقع کے بطور ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کردیا جائے جس کا اظہار رشید حسن خاں نے کہیں زیادہ تلخ لہجے میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''... اس زمانے میں مختلف اداروں کی طرف سے جو پرانی کتابیں شائع کی گئی ہیں، تدوین کے لحاظ سے ان میں بیش تر ساقط المعیار ہیں۔ یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ اس کو جن لوگوں کی سرپرستی حاصل ہے، ان میں سے اکثر اچھے دنیادار ہیں۔ یہ لوگ کتابوں کو علم کا مخزن اور تحقیق کا آئینہ سمجھنے کے بجائے ہنر کے ان نکڑوں کا مرادف سمجھتے ہیں جن پر بیج رکھ کر آگے بڑھا جاتا ہے۔ ایسے لوگ زبان سے تو یہی کہتے ہیں کہ بھائی! یہ اللہ کا کام ہے، یہ بڑی سعادت ہے جو ہمارے حصے میں آئی ہے ورنہ ہمارے پاس ہے کیا۔ بس دل میں لیے کی ایک بوند ہے اور سر میں خدمات زبان کا سودا، مگر ہیں یہ دراصل سوداگر۔ ان حالات کی بنا پر یہ توقع نہیں کرنا چاہیے کہ پرانے متن، آداب تدوین کی پابندی کے ساتھ، کچھ زیادہ تعداد میں شائع ہوسکیں گے۔ اچھی کتاب علم میں ضرور اضافہ کرتی ہے، مگر دنیا طلبی کی دوڑ میں وہ کچھ زیادہ ساتھ نہیں دے پاتی؛ اس لیے آدمی خواہ مخواہ پابندی آداب کے پھیر میں کیوں پڑے۔''

تجارت و سوداگری کے ایسے عہد میں خاں صاحب کا سب سے بڑا امتیاز ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز تلاش حق میں سرگرداں رہنا تھا۔ اپنے تحقیقی سفر کے آغاز ہی سے خاں صاحب نے ایک کٹھن ڈگر کو چن لیا تھا اور وہ یہ کہ جس بات کو انھوں نے غلط سمجھا اس کی بروقت گرفت کی اور اس سلسلے میں انھوں نے کبھی مصلحت کی پروا کی اور نہ تعلقات کا پاس رکھا۔ خاں صاحب نے احتساب کی اس روایت کی حرمت کو باقی رکھا جو اُن کو قاضی صاحب سے ملا تھا۔ یوں انھوں نے اپنے طرز تحقیق سے عملاً اس بات کا ثبوت دیا کہ جو شخص ترکِ تعلق کا آزار نہیں سہہ سکتا، اس کے مزاج کو تحقیق سے مناسبت نہیں ہوسکتی۔ اس سلسلے میں 'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' پر ان کے تبصرے کو بہ طور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ اپنے تبصرے میں انھوں نے اس کتاب کی خامیوں پر بھی شدید گرفت کی اور جن لوگوں پر ان کی چوٹیں پڑیں، وہ معمولی شخصیات نہ تھیں۔ اردو ادب کی عنان اس وقت ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھی لیکن وہ ان میں سے کسی سے مرعوب نہیں ہوئے۔ جس کام کو غلط سمجھا اس کی گرفت کی۔ ایسی گرفت کی جس کی کڑواہٹ اور تلخی کو آج بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے لکھا:

''اب سے کئی برس پہلے یہ خبر سُن کر مسرت ہوئی تھی کہ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن نے علی گڑھ یونی ورسٹی کی پیش کی ہوئی تاریخ ادب اردو کی اسکیم منظور کرلی ہے۔ یہ بات سن کر بھی اطمینان ہوا تھا کہ فاضلوں کی ایک جماعت اس کو مرتب کرے گی اور ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر صاحبان ترتیب و نظرثانی کے مشکل فرائض انجام دیں گے۔

برسوں کے انتظار کے بعد اس تاریخ کی پہلی جلد شائع ہوئی جس کو پڑھ کر سب سے پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ غالباً غلط نگاری کے کسی مقابلے میں حصہ لینے کے لیے اس کو مرتب کیا گیا ہے۔ کتاب کی تمہید میں کئی جگہ مغرب میں ادبی تاریخ نگاری کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کتاب بھی مغربی تاریخوں کے انداز و معیار کو ملحوظ رکھ کر اسی طرز پر مرتب کی گئی ہے، لیکن اس بات کو نظرانداز کردیا گیا ہے کہ وہاں اچھے علمی کام کرنے والے بددیانتی کو جائز نہیں سمجھتے، شاگردوں سے اور اپنے مجبور ماتحتوں سے بیگار نہیں لیتے اور یہ کہ وہاں ڈائرکٹری بہت بڑی حیثیت ہوتی ہے۔ اس کی محنت اور صلاحیت نظرثانی اور حسن ترتیب کے فرائض کا حق ادا کرتی ہے اور منتشر اجزا کی شیرازہ بندی کرتی ہے، جس سے یہ تاریخ معرا ہے۔ درحقیقت اس کو ایسے مضامین کا مجموعہ کہنا چاہیے، جن میں نہ باہم ربط ہے، نہ تناسب و توافق۔ اس کے بجائے متضاد بیانات، غیر متعلق تفصیلات، غلط سنین، غلط انتسابات، مفروضات اور غیر معتبر اقتباسات کی فراوانی ہے۔''

رشید حسن خاں کے اس تبصرے نے سہل نگاری، کم علمی اور غلط نگاری کا بھرم کھول دیا۔ ساتھ ہی اس تبصرے میں تحقیق کے اعلا اصولوں کا اور اس کے صحیح طریق کار کا عرفان حاصل ہوا۔ رشید حسن خاں نے اس تبصرے میں صرف اعتراضات ہی وارد نہیں کیے ہیں بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ اگر غلط ہے تو صحیح کیا ہے۔ بہ طور مثال اس مضمون کے اختتامیہ پر میں پروفیسر حنیف نقوی کی تحریر سے ایک اقتباس پیش کررہا ہوں:

''مضمون 'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' خاں صاحب کی وہ معرکہ آرا تحریر ہے جس کی اشاعت کے ساتھ علمی حلقوں میں ان کے تبحر علمی، وسعتِ نظر اور جرأتِ گفتار کی دھاک اس طرح قائم ہوئی کہ تن آسان مصنفوں اور سہل پسند محققوں کے لیے ان کا نام ضرب المثل کی علامت بن گیا۔ اس مضمون سے جہاں ایک طرف اس کتاب کی خامیاں نمایاں ہوکر سامنے آئیں، وہیں ان اصول و آداب کا تعین بھی ہوا جنھیں ملحوظ رکھے بغیر ادبی تاریخ نگاری کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔''

■◆■

بقیہ: سیّد نجیب اشرف ندوی...

صفحہ ۳ سے آگے

(زمیندار، لاہور)، 'اورنگ زیب اور اس کے بھائی' (انقلاب، لاہور)، 'جدید اردو ادب' (ہمدرد، دہلی)، 'اردو کی مکمل فہرست ایک مشورہ' (ہمدم، لکھنؤ)، 'بہار میں اردو کی ترویج و اشاعت کا ایک منصوبہ' (اتحاد، پٹنہ)، 'اورنگ زیب اور اسلام کی تبلیغ' (الجمعیہ، دہلی) اور 'ایک کہانی گھر کی زبانی' (سب رس، حیدرآباد) وغیرہ۔ پرانے رسائل و جرائد کی چھان بین اور پھر ان کی ورق گردانی کے بعد سیّد نجیب اشرف ندوی مرحوم کے ایسے کچھ مضامین راقم کے ہاتھ لگے۔ پرانے رسائل کی فائلیں کھنگالی جائیں تو کچھ اور مضامین بھی یقیناً ہاتھ لگیں گے۔

سیّد نجیب اشرف ندوی کے 'معارف' اور ہندستان کے دوسرے رسائل و اخبارات میں شائع شدہ جن مضامین و مقالات کے ہم نے نام لیے ہیں ان سب کا فرداً فرداً محاسبہ ہمارا مقصد نہیں۔ محدود صفحات کا ایک مقالہ اس کا متحمل بھی نہیں ہوسکتا۔

۱۹۳۰ تک اردو کے نامور نقاد پروفیسر احتشام حسین اعظم گڑھ میں ہی قیام پذیر تھے۔ اعظم گڑھ کے قیام کے دوران وہ ندوی صاحب سے وقتاً فوقتاً ملتے رہتے تھے۔ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ندوی صاحب کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ احتشام حسین صاحب کا ندوی صاحب پر لکھا ہوا یہ مضمون ماہنامہ 'شاعر' کے 'گوشۂ نجیب اشرف ندوی' میں شامل ہے۔

دارالمصنّفین کے قیام کے دوران سیّد نجیب اشرف ندوی صاحب نے جب ایم اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کرلیا تو ۱۹۳۰ میں گجرات کے صدر مقام احمد آباد چلے گئے اور یہاں کے ایک کالج میں لکچرار کے عہدے پر فائز کردیے گئے۔ گمان غالب ہے کہ دارالمصنّفین کے قلیل مشاہرے نے انھیں وہاں سے ہٹنے کے لیے مجبور کیا ہوگا۔ معاش کی تنگی کبھی کبھی ایسے سخت فیصلے کرنے پر آمادہ کردیا کرتی ہے۔ میں چوں کہ سیّد نجیب اشرف ندوی مرحوم سے بہت قریب تھا اور ان سے متعلق امور کو جاننے کی کوشش کرتا رہتا تھا، چناں چہ ایک بار میں نے ان سے جاننا چاہا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ علامہ شبلی نعمانی کی یادگار اور ایسی عظیم علمی و ادبی خانقاہ کو انھوں نے خیرباد کہا جب کہ ادارے کے دوسرے ارکان مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن وغیرہ نے بہت ہی قلیل مشاہروں پر عمریں گزار دیں اور اس ادارے کو چھوڑنے کا نام تک نہیں لیا۔ میرے اس سوال کے جواب میں انھوں نے یہ تو نہیں کہا کہ مالی منفعت کے حصول کے لیے انھوں نے ایسا کیا لیکن انھوں نے یہ ضرور کہا کہ علامہ سیّد سلیمان ندوی کے ایما پر وہ احمد آباد کے کالج میں پڑھانے کے لیے گئے۔ ندوی صاحب نے احمد آباد کے کالج کا رخ کیا تو لیکن وہاں سال دو سال سے زیادہ درس و تدریس کا فریضہ انجام نہیں دے سکے نتیجتاً وہ ممبئی کے مشہور تعلیمی ادارے اسماعیل یوسف کالج کے بلاوے پر ممبئی چلے آئے۔ ممبئی وارد ہونے کے بعد ان کی علمی و ادبی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ ان کی حیات کا دورِ اوّل دارالمصنّفین سے وابستہ تھا۔

جس زمانے میں سیّد نجیب اشرف ندوی مرحوم اسماعیل یوسف کالج آئے اس زمانے کا وہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا عکس و پرتو تھا۔ ویسے تو یہ کالج جسے اسماعیل یوسف کالج کے نام سے جانا جاتا ہے، علوم شرقیہ کا خوب صورت گہوارہ تھا لیکن انگریزی تعلیم اور مغربی علوم و فنون سے بھی کوئی بیر اسے نہیں تھی۔ یہاں کے زیادہ تر اساتذہ اردو فارسی اور عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان و ادب اور مغربی علوم و فنون کے رسیا تھے۔ ڈاکٹر بذل الرحمٰن، ڈاکٹر داؤد پوتا، پروفیسر ابراہیم ڈار، ڈاکٹر مختار، ڈاکٹر ہمدانی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور ڈاکٹر سراج الحسن نقوی وغیرہ جیسے ماہرین علم و ادب نے کالج کے اوّلین دور کو وجاہت (Respectbility) کے دورِ خاص میں تبدیل کردیا تھا۔ اس بزم ہزار صفات میں نجیب اشرف ندوی صاحب کی جب شمولیت ہوئی تو اس میں چار چاند لگ گیا۔

اردو کے مشہور اور ممتاز نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے سیّد نجیب اشرف ندوی کے انتقالِ پُر ملال پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے ہفتہ وار جریدہ 'ہماری زبان' کا اداریہ 'ایک روشن چراغ تھا نہ رہا' کے عنوان سے سپردِ قلم کیا تھا۔ اپنے اس اداریے میں آل احمد سرور صاحب نے پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی مدبرانہ شان، عظمت اور ان کے علمی و ادبی کمالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا کہ ۱۹۳۷ میں یونیورسٹی کی تعطیل کے دوران وہ ممبئی گئے ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا، ندوی صاحب کے ہمراہ وہ اسماعیل یوسف کالج گئے، اس وقت کے پرنسپل ڈاکٹر بذل الرحمٰن تھے۔ سرور صاحب کے سامنے کالج کے طلبہ نے گجرات کا مشہور رقص گربہ پیش کیا۔ رقص جب ختم ہوا تو ندوی صاحب نے کالج کے مہمان پروفیسر آل احمد سرور سے مخاطب ہوکر بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ ہمارے کالج کے طلبہ ہندو مسلم تہذیب کی نمائندگی اسی شان سے کرتے ہیں۔ سیّد نجیب اشرف ندوی صاحب نے اسماعیل یوسف کالج میں ایک طویل عرصہ گزارا، اس دوران انھوں نے طلبہ کی کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہا کرتی تھی کہ ان کے تلامذہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیں اور نام کمائیں۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالستار دلوی ان کے مشہور اور باکمال شاگردوں میں شامل ہیں۔ اس وقت دلوی صاحب اردو تحقیق اور لسانیات کے بڑے معتبر اور مستند عالم ہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے استاد نجیب اشرف ندوی کا نمایاں ہاتھ ہے۔ ان کے کچھ دوسرے شاگردوں نے بھی زندگی کے مختلف میدانوں میں بڑا نام کمایا۔

اسماعیل یوسف کالج میں درس و تدریس کی طویل اور یادگار خدمات انجام دینے کے بعد جب ندوی صاحب ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے وہ ڈائرکٹر ہوگئے، وہ اس ادارے کے بانی ڈائرکٹر تھے۔ یہاں سے انھوں نے اردو کا تحقیقی سہ ماہی جریدہ 'نوائے ادب' بھی جاری کیا جو کافی مشہور ہوا۔ یہ تحقیقی جریدہ آج بھی جاری ہے۔ اس وقت اس کے اڈیٹر اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالستار دلوی ہیں۔ سیّد نجیب اشرف ندوی صاحب جب تک زندہ تھے انسٹی ٹیوٹ ہذا کے ڈائرکٹر اور اس کے ترجمان 'نوائے ادب' کے مدیر رہے۔ ان کی ادارت کی مدت میں 'نوائے ادب' کو ہندستان اور پاکستان میں جو وقار اور مرتبہ حاصل ہوا وہ لائقِ تعریف تھا۔ ہم یہ بات پہلے ہی واضح کرچکے ہیں کہ بہ حیثیت ایک رفیق جب وہ دارالمصنّفین میں داخل ہوئے تھے تو یہاں ان کی علمی، تحقیقی اور ادبی زندگی کا دورِ اوّلین تھا جسے صحیح معنوں میں مثالی دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اسماعیل یوسف کالج کی ان کی ملازمت کو بھی یادگار قرار دیا جاسکتا ہے اس لیے کہ یہاں انھوں نے ذہن سازی کا اہم فریضہ انجام دیا لیکن اس کے باوجود انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے ان کی طویل وابستگی ان کی زندگی کے دوسرے دور کی نمائندگی کرتی تھی کیوں کہ یہاں کے ان کے کام کاج کی نوعیت دارالمصنّفین کے کام کاج کے مماثل تھی۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے وابستگی کے زمانے میں نجیب اشرف ندوی صاحب نے بیک وقت کئی اہم کام انجام دیے، پہلا بڑا کام انھوں نے یہ کیا کہ اس ادارے کا انھوں نے ممبئی یونیورسٹی سے الحاق کرایا اور پھر وہاں سے ایم اے اردو اور فارسی کی کلاسیں جاری کرائیں۔ یہ ذہن میں رکھی جانے والی بات ہے کہ اس وقت ممبئی یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ موجود نہیں تھا۔ ندوی صاحب کے اس اقدام سے اردو اور فارسی میں ایم اے کرنے والوں کے لیے بڑی آسانیاں پیدا ہوگئیں، پھر انھوں نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا اپنا ایک بڑا ذاتی کتب خانہ قائم کیا جس میں نادر کتابیں اور مخطوطے جمع کیے۔ سہ ماہی 'نوائے ادب' کے اجرا کا کام بھی کم اہم نہیں تھا جس کے سبب بے شمار تحقیقی اور لسانی مقالات کا سرمایہ جمع ہوا۔ 'نوائے ادب' کی ادارت کے زمانے میں انھوں نے 'لغات گجری' کی ترتیب و تدوین کا وہ اہم کام کیا کہ جس کی شہرت کا سکہ جاری ہوگیا۔ 'نوائے ادب' میں سیّد نجیب اشرف ندوی صاحب نے 'مقالہ نما' کا جو مستقل کالم شروع کیا اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس مستقل کالم کے ذریعے ہند و پاک میں شائع شدہ جرائد کے مضامین و مقالات کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔ اشاریہ سازی کی جس شاندار روایت کا آغاز سیّد نجیب اشرف ندوی نے کیا تھا اس کی تجدید ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے دوبارہ کی ہے اور 'مقالہ نما' کے مرتبین میں راقم الحروف کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ 'نوائے ادب' میں شامل کیا جانے والا 'مقالہ نما' کالم تحقیق کا کام کرنے والوں کے لیے بڑا مددگار ثابت ہوگا۔

سیّد نجیب اشرف ندوی مرحوم کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے عبدالرزاق قریشی کو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا ریسرچ فیلو مقرر کرکے ان سے بڑے بڑے تحقیقی کام لیے۔ ادب و تحقیق کی دنیا سے تعلق رکھنے والے لوگ عبدالرزاق قریشی کی مطبوعات 'نوائے آزادی'، 'مرزا مظہر جانِ جاناں'، 'مکاتیب مرزا مظہر'، 'مبادیاتِ تحقیق' اور 'راگ مالا' وغیرہ کو بھلا کیسے بھلا سکتے ہیں۔ ۱۵ر ستمبر ۱۹۶۸ کو جب ندوی صاحب کا انتقال ہوا تو عبدالرزاق قریشی مرحوم نے 'نوائے ادب' کی ادارت بہتر ڈھنگ سے سنبھالی۔ سیّد نجیب اشرف ندوی نے سہ ماہی 'نوائے ادب' میں لکھنے والوں کی ایک ایسی صف تیار کی جس میں برصغیر ہند و پاک کے چوٹی کے ادیب و محقق شامل تھے۔ میرے پاس سیّد مسعود حسن رضوی ادیب، عبدالستار صدیقی، محی الدین قادری زور، سیّد نصیر الدین ہاشمی، عبدالقادر سروری، مالک رام، نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، رشید حسن خاں، بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر گوپی چند نارنگ، اختر جوناگڑھی، گیان چند جین، اکبر الدین صدیقی، اختر اورینوی، سیّد احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، رشید احمد صدیقی، مسعود عالم ندوی، پنڈت دتاتریہ کیفی اور غلام رسول مہر وغیرہ کے سیّد نجیب اشرف ندوی کے نام لکھے گئے خطوط موجود ہیں۔ ان خطوط کو ندوی صاحب نے انتقال سے قبل میرے حوالے کردیے تھے۔ ان خطوط میں نہ صرف یہ کہ 'نوائے ادب' کی خصوصیات کا ذکر ہے بلکہ اس میں لکھنے کی خواہش اور وعدے کا اعادہ بھی موجود ہے۔ نجیب اشرف ندوی صاحب کے یادگار کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے، میں ان کے تمام یادگار کارناموں پر طوالت کے خوف سے روشنی نہیں ڈال سکا ہوں لیکن ان کے بارے میں اس مقالے میں، میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی عظیم شخصیت کو سمجھنے میں مدد ضرور ملے گی۔

●●●

رشید حسن خاں: بہ حیثیتِ مبصر

ڈاکٹر محمد وسیم رضا (رام ڈیہا، پوسٹ گوندرا دوا یا مبسی، ضلع مشرقی چمپارن 845426، بہار)

رشید حسن خاں کی بنیادی شناخت محقق کی ہے۔ تحقیق اور تدوین ان کا اصل میدان ہے مگر اس کے علاوہ بھی ان کی شخصیت کے گوشے ہیں جو متنوع اور گوناگوں صفات کے حامل ہیں۔ اگر بہ غور مطالعہ کیا جائے تو رشید حسن خاں کے تبصروں سے بھی ہمیں ان کے وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ خاں صاحب کے تبصروں میں چار تبصرے جن کو بہ وجوہ معاصر ادبی تحقیق میں ایک زندہ تحریر کی حیثیت سے پڑھا گیا اور جن سے بحث و تمحیص کے دروازے بھی کھلے۔ وہ اس طرح ہیں:

۱- دیوان غالب (صدی اڈیشن) مرتبہ: مالک رام
۲- اردو شاعری کا انتخاب مرتبہ: ڈاکٹر محی الدین قادری زور
۳- علی گڑھ تاریخ ادب اردو (آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری)
۴- تاریخ ادب اردو مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی

ان مذکورہ بالا کتابوں پر رشید حسن خاں کے واقعی اعتراضات کو کم نظروں نے حقِ تحقیق سے تعبیر کیا۔ لیکن خاں صاحب کی ان تحریروں کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا وہ دراصل سچ کی تلاش تھی۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے نامور محققین کی حرف گیری کی ہے لیکن واضح رہنا چاہیے کہ تحقیق کا مقصد ان کے نزدیک حقائق کی بازیافت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اپنے موقف کو انھوں نے تواتر کے ساتھ واضح کیا ہے۔ انھوں نے صاف اور دوٹوک انداز میں لکھا ہے کہ:

''میں صاف، سادہ، واضح اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دلچسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں گے یا منفی۔ ایسی فضول اصطلاحوں سے میں دور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سچ کی تلاش ہے، مجھے جھوٹ سے دلچسپی نہیں، اس لیے جو کہا یا لکھا ہے اس سے دلچسپی ہے۔ جھوٹ کوئی بھی بولے، وہ جھوٹ ہے۔ میں سچ کو جھٹلانے کا قائل نہیں ہوں۔''

ایک ایسے محقق جس نے سچ کی تلاش میں ایک عمر بسر کی ہو وہ بجا طور پر دوسرے محققین سے بھی توقع کرے گا کہ ایک محقق اپنے محققانہ نتائج کی پیش کش میں ابہام کو قطعاً روا نہ رکھے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ حقیقت کے خد و خال مسخ ہونے لگتے ہیں بلکہ عدم تحقیق کو بھی جگہ ملنے لگتی ہے۔

مشہور ناقد پروفیسر قمر رئیس نے رشید حسن خاں کے تحقیقی رویے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''رشید حسن خاں کی محبت اپنی جگہ، لیکن ان کی ذات میں ہمیشہ مجھے ایک طرح کی بے چینی، تلخی، بیزاری اور برگشتہ دلی کا شدت سے احساس ہوا۔ ابتدا میں مدت تک وہ منفی نکتہ چینی پر آمادہ رہتے تھے۔ کسی علمی یا کسی مشہور ادبی شخصیت کو Demolish کرکے انھیں جو داد ملتی تھی اس سے وہ خوش ہوتے تھے۔ شاید اس معاملے میں ان پر قاضی عبدالودود صاحب کے موقف کا بھی اثر تھا۔''

دراصل بات یہ ہے کہ یہ رشید حسن خاں کی صاف گوئی تھی جسے قمر رئیس اور انھی کی طرح ان کے بعض ہم عصروں نے خاں صاحب کی 'جارحیت' سے تعبیر کیا ہے۔ احتساب کی سخت گیری کو بے چینی، تلخی، بیزاری یا برگشتہ دلی سمجھ لینے کا حق اگر قمر رئیس صاحب کو تھا اور اپنی اس رائے کے اظہار میں وہ آزاد تھے تو خاں صاحب کو بھی اتنی آزادی تو ملنی ہی چاہیے تھی۔ انھوں نے اپنی آزادی کو تحقیق میں بے لاگ اظہارِ رائے کے لیے استعمال کیا تو اس میں غلط کیا تھا؟ جہاں تک قاضی عبدالودود سے اثر قبول کرنے کا سوال ہے تو خاں صاحب نے قاضی عبدالودود پر لکھتے ہوئے پرزور الفاظ میں قاضی صاحب کے تحقیقی موقف کی حمایت کی ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''...یہ دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ تحقیق کے نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہے یا نہیں اور یہ فضول بات ہے کہ اعتراض بد نیتی سے کیا گیا ہے یا کسی اور وجہ سے۔ نیت کو درمیان میں لانے کی بات ان لوگوں کی وضع کردہ ہے جو سہل پسندی اور تعلقات نگاری کو جوابی الزام کے پردے میں چھپانا چاہتے ہیں یا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے کسی ممدوح کی پردہ پوشی کی جائے... قاضی صاحب نے اپنی تحریروں کے واسطے سے تسلسل کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ احتساب کا تعلق صحیح و غلط سے ہے۔ اعتراض اگر صحیح ہے تو ٹھیک ہے، وہ اعتراض کس نیت سے کیا گیا تھا، یہ غیر متعلق بات ہے اور اس کی کچھ حیثیت نہیں۔''

یعنی رشید حسن خاں کے تحقیقی جائزے کے حوالے سے صرف یہ دیکھا جائے گا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ از روئے تحقیق درست ہے یا نہیں۔ اب ان کے سخت گیر احتساب کی زد میں کون آتا ہے اور کیسی کیسی شخصیتیں Demolished ہوتی ہیں، یہ بہرحال ایک غیر متعلق بات ہوگی اور بے حیثیت بھی۔

'دیوان غالب' (صدی اڈیشن) مرتبہ: مالک رام پر خاں صاحب کے تبصرے کے ابتدائی جملے کچھ اس طرح ہیں:

''تدوین کے طلبہ کے لیے زیرِ بحث نسخۂ دیوان غالب کا مطالعہ اس لحاظ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ بات معلوم ہو کہ کسی دیوان کو کس طرح مرتب نہیں کرنا چاہیے۔ اس اڈیشن کے مرتب نے تدوین کے اصولوں کو جس طرح نظر انداز کیا ہے، اس کی مثالیں کم یاب ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ مرتب نے اس صدی اڈیشن کی بنیاد دیوان غالب کے جس نسخے پر رکھی ہے اور جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کی غلطیوں کی تصحیح غالب نے اپنے قلم سے کی تھی، اور جس کے متعلق یہ کہا ہے کہ وہ نسخہ حیدرآباد کی آصفیہ لائبریری میں محفوظ ہے؛ وہ نسخہ وہاں موجود نہیں۔ یہی نہیں، کسی اور جگہ بھی اب تک اس کا موجود ہونا معلوم نہیں۔ مفروضات پر تدوین کی بنیاد کس طرح رکھی جاسکتی ہے، اور کسی مصنف کے واضح بیانات پر کسی مجہول الاحوال کاتب کے اندراج نگارش کو کس طرح ترجیح دی جاسکتی ہے، یہ صدی اڈیشن اس کی بہت اچھی مثال ہے۔''

خاں صاحب نے ایک علمی گرفت اس اقتباس میں کی ہے اور آگے بہ طور دلیل کے ثبوت بھی پیش کیے ہیں کہ مرتب موصوف نے اس نسخے کو بہ چشمِ خود نہیں دیکھا۔ اگر رشید حسن خاں کے اس دعوے کی تردید تحقیقی شواہد کی روشنی میں (جو قابلِ قبول ہو) کرنے کے بجائے اگر جوابی الزام کا سلسلہ شروع کیا جائے تو یہ کسی طور مناسب بات نہیں ہوگی۔ البتہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کی خامیوں کے بیان کے ساتھ مالک رام کے اکتسابات کا بھی اعتراف کیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن رشید حسن خاں نے اگر مالک رام کے اکتسابات کا اعتراف کر بھی لیا ہوتا تو ان کی علمی گرفت اپنی جگہ قائم رہتی۔ تاآنکہ یہ بات ثابت نہیں کردی جاتی کہ مالک رام نے اس نسخے کو دیکھا ہے جس پر انھوں نے دیوان غالب صدی اڈیشن کے متن کی بنیاد رکھی تھی۔

اس سلسلے کا دوسرا اہم تبصرہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی مرتب کردہ 'اردو شاعری کا انتخاب' پر ہے جسے ساہتیہ اکیڈمی نے دسمبر ۱۹۶۰ میں شائع کیا۔ اس میں تحریفِ متن کے ساتھ ساتھ انتخاب میں عدم توازن جس طرح موجود ہے، اس کا سخت نوٹس لیتے ہوئے رشید حسن خاں نے لکھا:

''ساہتیہ اکیڈمی ملک کا مقتدر ادارہ ہے اور مرتب کا شمار بھی معروف لوگوں میں ہوتا ہے، اس لیے خیال یہ تھا کہ یہ انتخاب اعلا معیار پر پورا اترے گا اور یہ انتخاب کی صحت مند روایت کی تشکیل کرے گا۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ انتخاب ہر طرح کی خامیوں سے بھرا ہوا ہے۔ مرتب نے تحقیق اور تدوین کے آداب کی پابندی کو قطعاً غیر ضروری سمجھا ہے۔ صحتِ متن کے وہ قائل نہیں معلوم ہوتے، ماخذ کی نشان دہی کو ضروری نہیں سمجھتے اور واقعات اور سنین کی درستی کی اہمیت نہیں دیتے۔ یہی نہیں، انھوں نے غضب یہ کیا ہے کہ اشعار کے متن میں من مانی تبدیلیاں کی ہیں۔ دوسروں کی نظموں اور غزلوں پر اپنی طرف سے عنوان چپکا دیے ہیں اور نظموں کی ہیئت کو بھی تبدیل کرنے سے گریز نہیں کیا ہے۔''

رشید حسن خاں کے اعتراضات جن کا بیان انھوں نے مذکورہ بالا اقتباس میں کیا ہے، وہ محض دعوا نہیں ہے بلکہ اپنے تبصرے میں ہر ایک اعتراض سے متعلق کافی (بقیہ صفحہ ۲ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایوینیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۵۰ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org